اطاعت کا قرآنی تصوّر

بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک درسِ قرآن سے ماخوذ

مرتّب

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۲﴾ (التغابن)

’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ پھر اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔‘‘

سورۃ التغابن کے مضامین کا تعارف

سورۃ التغابن دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے رکوع میں دس اور دوسرے رکوع میں آٹھ آیات ہیں۔ پھر پہلے رکوع کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا بیان ہے۔ یعنی خبریہ (narrative) انداز میں توحید' معاد اور رسالت جیسے حقائق کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اگلی تین آیات (۸ تا ۱۰) دعوتِ ایمان پر مشتمل ہیں کہ ان حقائق پر ایمان لاؤ' انہیں مانو' انہیں تسلیم کرو!

دوسرے رکوع کی آٹھ آیات میں سے پہلی پانچ آیات ایمان کے ثمرات و نتائج اور اس کے مضمرات پر مشتمل ہیں۔ حقیقی ایمان اگر دلوں میں جاگزیں اور ذہن و فکر کے اندر پیوست ہو گیا ہو' رچ بس گیا ہو تو اس کے کچھ ثمرات و نتائج نکلنے چاہئیں' جیسا کہ ایک مقولہ ہے: ’’درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے‘‘۔ چنانچہ قلب کے اندر اگر وہ مخفی حقیقت جس کا نام ’’ایمان‘‘ ہے' موجود ہے تو اس کی پہچان جن ثمرات و نتائج سے ہوتی ہے' انہیں ان پانچ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر آخری تین آیات میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بڑی پُرزور دعوت دی گئی ہے۔

آیت زیر درس کا محل و مقام

دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات جن میں ایمانیات کے مضمرات کو واضح کیا گیا ہے' ان میں سے چار آیات کا تعلق انسان کے فکر و عمل سے ہے۔ یعنی ایمانِ حقیقی حاصل ہونے کے بعد انسان کی سوچ اور اس کے زاویۂ نگاہ میں کیا انقلاب آنا چاہیے اور اس کے باطنی احساسات میں کیا تبدیلی آنی چاہیے۔ جب اس نے اللہ کو مانا ہے تو اسے اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے' اسے تسلیم و رضا کی کیفیت کا حامل ہونا چاہیے اور اللہ سے کسی شکوہ و شکایت یا ناراضگی کی کیفیت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح اس کا سارا دار و مدار' بھروسہ' توکل اور تکیہ اسباب و وسائل پر نہیں' بلکہ مسبّب الاسباب یعنی ذاتِ باری تعالیٰ پر ہو جانا چاہیے۔ پھر یہ کہ دنیا میں جتنی بھی چیزوں سے اس کا تعلق ہے' خواہ وہ کہ جن سے اس کا سلسلۂ حیات وابستہ ہے' یعنی معاشی اسباب و ذرائع وغیرہ اور خواہ وہ علائق دُنیوی کے زمرے میں سے ہوں' ان کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر میں واضح تبدیلی آنی چاہیے۔ انسان کو آگاہ رہنا چاہیے کہ جہاں محبت ہو وہیں خطرہ ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی اولاد' والدین' اعزہ و اقارب اور بیویوں (اور بیویوں کو شوہروں) سے جو طبعی محبت ہے یہی درحقیقت خطرے کی علامت ہے۔ یہ محبت اگر ایک حد کے اندر رہے' یعنی اللہ کی محبت کے تابع رہے تو صحیح ہے' درست ہے' لیکن اگر یہ اس حد سے بڑھ جائے تو انسان کی عاقبت برباد ہو جاتی ہے۔ یہ ہے نقطۂ نظر کی وہ تبدیلی جو ایمان کا تقاضا ہے۔ یعنی مال و اسبابِ دُنیوی اور اولاد کو ایک فتنہ و آزمائش سمجھنا چاہیے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں آزما رہا ہے۔ چنانچہ ان پانچ آیات میں سے چار آیات انسان کے فکر و نظر کی تبدیلی کے بیان پر مشتمل ہیں' جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے۔ اور یہی وہ آیت ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا مرکز و محور ہے:

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۲﴾

رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری اللہ کے احکام پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ان احکام پر عمل

کرنا سراسر تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور اس کی جواب دہی خود تمہیں کرنی ہو گی۔ جس طرح ایمانی حقائق تو اپنی جگہ اٹل ہیں' کوئی مانے تب بھی اور کوئی نہ مانے تب بھی' لیکن انہیں ماننے میں تمہاری فلاح و کامیابی ہے' اسی طرح اللہ کے احکام تو اپنی جگہ برحق ہیں' واجب التعمیل ہیں' لیکن تمہیں ان پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو اس میں تمہاری فلاح و نجات اور اللہ کی رضا ہے۔

اطاعت کے مضمرات

یہاں یہ نسبت و تناسب قابل توجہ ہے کہ ثمراتِ ایمانی میں اصل اہمیت گویا فکر و نظر کی تبدیلی کی ہے' جس کا نتیجہ انسان کے عمل کی تبدیلی کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ یہاں چار آیات فکر و نظر کی تبدیلی پر اور صرف ایک آیت عمل کی تبدیلی کے بارے میں وارد ہوئی ہے' اگرچہ یہ ایک آیت اپنے طور پر اس قدر اہم اور جامع ہے کہ اگر اس پر نگاہ کو جما لیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ اس پر ''تِل کی اوٹ میں پہاڑ'' والا محاورہ صادق آتا ہے' یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''سو سنار کی اور ایک لوہار کی'' یا ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' والا معاملہ نظر آتا ہے' اس لیے کہ ایک لفظ ''اطاعت'' میں شریعت کے تمام اوامر و نواہی مضمر ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''اللہ کا حکم مانو'' تو اس سے مراد اللہ کے تمام احکام ہوتے ہیں' کیونکہ اللہ کا حکم نماز پڑھنے کا بھی ہے' رمضان کے روزے رکھنے کا بھی ہے' صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی ہے' اور صاحبِ استطاعت کے لیے حج کرنے کا بھی ہے۔ پھر یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ اس کے دین کی دعوت دو' دین کی تبلیغ و اشاعت کرو' نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو! یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام جانو' حلال پر قناعت کرو اور حرام سے اجتناب کرو! اور یہ بھی اللہ کا حکم ہے کہ دین کے لیے جہاد کرو' کلمۂ حق کہو' عدل و قسط پر قائم رہو' حق کے علمبردار بن جاؤ' انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ —— اور اللہ کے دین کو قائم کرو! پھر یہ کہ اس کے لیے جان کھپاؤ' مال کھپاؤ' اور اگر ضرورت پڑے تو نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاؤ! —— یہ سب احکام ہی تو ہیں' لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ قرآن میں

جہاں اللہ کا حکم ماننے کی بات ہوتی ہے ہمارا ذہن نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ سے آگے کچھ نہیں سوچتا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سور نہیں کھانا' شراب نہیں پینی اور زنا نہیں کرنا۔ اس سے آگے اللہ کا کوئی حکم ہمارے سامنے ہے ہی نہیں۔

ہمارے ہاں عمل کا جو سارا فساد پیدا ہوا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ تو ایمان کا فقدان ہے۔ جس چیز کو ایمان سمجھا جاتا ہے وہ محض ایک موروثی عقیدہ (racial creed) ہے جو ماں باپ کی طرف سے چلا آ رہا ہے۔ حقیقی ایمان کا حال تو یہ ہے کہ ع ''ڈھونڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبا لے کر!'' کے مصداق تلاش کرنے پر شاید کہیں نظر آ جائے۔ پھر یہ کہ جہاں ایمان کچھ موجود بھی ہے وہاں فرائض کا تصوّر محدود ہے اور سارے کا سارا ایمانی جوش و جذبہ انہی ''عبادات'' کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ جوں جوں ایمانی جذبہ ترقی کرتا ہے تو انسان فرائض کے بعد مستحبات و نوافل میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے — لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کے احکام تو سب کے سب برابر ہیں' اللہ کا حکم جس طرح زنا اور شراب کی حرمت کا ہے اس سے کہیں بڑھ کر سود کی حرمت کا بھی ہے اور یہ کہ اگر وہ اللہ کے احکام میں کہیں اپنی پسند اور مرضی سے یا اپنی سہولت اور مصلحت کی خاطر ذرا سی بھی تفریق اور تقسیم کر لے تو اس طرزِ عمل کے لیے قرآن میں بہت سخت وعید آئی ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ)

''کیا تم ہماری کتاب (و شریعت اور ہمارے اوامر و نواہی) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟ تو کوئی سزا نہیں ہے اس کی جو تم میں سے یہ روش اختیار کرے سوائے اس کے کہ اسے دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو!''

اس اعتبار سے آپ غور کیجیے کہ ''وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کہنے کو تو دو چھوٹے چھوٹے جملے ہیں' لیکن ان میں ایک قیامت مضمر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں تک

کی اوٹ میں پہاڑ موجود ہے۔ شریعت کے تمام اوامر ونواہی اور تمام دینی ذمہ داریوں کا ذکر ان چند الفاظ میں موجود ہے:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اُس کے) رسولؐ کی''

اس کے ساتھ ہی بڑے استغناء کے انداز میں یہ فرمادیا گیا کہ اگر تم نے روگردانی کی' پیٹھ دکھائی' اعراض کیا' انکار کیا تو اس میں اللہ کا کوئی نقصان ہے نہ اس کے رسولؐ کا:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝

''پھر اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ (ہمارے) رسول کی ذمہ داری صرف پہنچادینے کی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذمہ داری ادا فرمادی' وہ فارغ ہوئے' اب عمل کی ذمہ داری تمام تر تم پر ہے' اور اگر تم اس میں کوتاہی کرو گے تو اللہ کی کوئی احتیاج تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے' اس کا کوئی کام تمہاری اطاعت کے بغیر رکا ہوا نہیں ہے' جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں الفاظ آئے ہیں کہ:

''اے میرے بندو! اگر تمہارے اوّلین بھی اور آخرین بھی' انسان بھی اور جن بھی' سب کے سب اتنے متقی ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی بڑے سے بڑا متقی ہو سکتا ہے' تب بھی میری سلطنت اور میرے کارخانۂ قدرت میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا —— اور اگر تمہارے اوّلین و آخرین اور انس و جن سب کے سب ایسے ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی زیادہ سے زیادہ سرکش و نافرمان ہو سکتا ہے' تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی''۔(۱)

معلوم ہوا کہ اللہ تو غنی ہے' اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ' لیکن اس کے احکامات کی پابندی میں خود ہماری خیر اور بھلائی ہے۔

آیت زیر درس کے مطالعہ کا آغاز کرنے سے پہلے یہ نسبت و تناسب ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجیے کہ یہاں فکر و نظر کی تبدیلی پر چار آیات اور دعوتِ عمل پر صرف

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔ راوی: ابوذر غفاریؓ۔

ایک آیت آئی ہے‘ اس لیے کہ تمام فرائض کی ادائیگی اور تمام اوامرونواہی کی پابندی کا دارومدار ہی فکرونظر کی تبدیلی پر ہے۔ یہ تبدیلی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے جس قدر زیادہ ہوگی‘ اس کے اندر جس قدر زیادہ پختگی اور دوام ہوگا اور ایمانِ حقیقی جس قدر قلب کی گہرائیوں میں راسخ اور فکرونظر میں پیوست ہو جائے گا اسی قدر انسان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کر سکے۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں باہم لازم وملزوم کے درجے میں ہیں۔ اب ہم اس آیت مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اطاعت کا مفہوم

مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں لفظ ’’اطاعت‘‘ اس سے قبل صرف ایک جگہ یعنی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت لقمان کی نصائح میں جو اضافہ کیا گیا اس میں یہ مضمون آیا ہے کہ اگر مشرک والدین تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو تو ان کی اطاعت مت کرو! وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ کہ پھر تم ان کا کہنا مت مانو‘ یہاں وہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اگرچہ والدین کا مقام اتنا بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے فوراً بعد والدین کے شکر کو لازم قرار دیا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ لیکن اگر وہ اپنے اس مقام سے مزید بلند ہو کر اللہ سے بھی بالاتر ہونا چاہتے ہیں اور اللہ کے احکام کے خلاف کوئی حکم دینا چاہتے ہیں تو ان کا کہنا نہیں مانا جائے گا‘ کیونکہ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) (۱) یعنی جس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم آتی ہو اس معاملے میں مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت نہیں کی جا سکتی! —— لیکن اصلاً یہ آیت مبارکہ (آیت زیر درس) ہمارے منتخب نصاب میں اطاعت کی تاکید پر مشتمل پہلا مقام ہے۔

لفظ اطاعت اگرچہ عام طور پر کسی بھی حکم برداری‘ فرمانبرداری‘ کسی کے حکم کو مان لینے اور اس کی تعمیل کے لیے استعمال ہو جاتا ہے‘ چاہے وہ برضا و رغبت اور دلی آمادگی

---

(۱) جامع الصغیر للسیوطی‘ ح:۹۹۰۳‘ راوی: عمران بن حصینؓ۔ مشکوٰۃ المصابیح‘ کتاب الامارۃ والقضاء‘ الفصل الثانی۔

سے ہو چاہے بالجبر ہو لیکن دراصل اس لفظ کا مادہ ''طوع'' ہے جو ''کرہ'' (مجبوری یا کراہت کے ساتھ کسی کا حکم ماننا) کی ضد ہے۔ چنانچہ یہ لفظ (طوع) قرآن حکیم میں ''کرہ'' کی ضد کے طور پر تین مقامات پر آیا ہے:

(۱) سورۂ آل عمران کی آیت ۸۳ میں فرمایا:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

یعنی آسمانوں اور زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں وہ سب کی سب اللہ کے حضور میں جھکی ہوئی ہیں' اس کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں' دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور کراہت کے ساتھ بھی' کیونکہ ان کے لیے کوئی اور چارۂ کار ہے ہی نہیں۔ خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے وجود کا اکثر و بیشتر حصہ جبراً اللہ کی اطاعت کر رہا ہے' اس لیے کہ ہمارے اس جسمانی وجود کی پوری فزیالوجی اور پورا جسمانی نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ ہم تو اس پر بھی قادر نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کا اُگنا بند کر دیں۔ البتہ جہاں اس نے ہمیں اپنا اختیار استعمال کرنے کی کچھ اجازت دی ہے وہاں اگر ہم اپنے اختیار سے اس کے دیے ہوئے اختیار کو اسی کے قدموں میں ڈال دیں تو یہی ہماری کامیابی ہے۔

جان دی' دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اس اعتبار سے ''طوع'' اور ''کرہ'' دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۲) اسی طرح سورۃ الرعد کی آیت ۱۵ جو آیت سجدہ ہے' کے الفاظ ہیں:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

کہ اللہ کے لیے سجدے میں گری ہوئی ہے ہر شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے' طوعاً بھی اور کرہاً بھی —— یعنی بطوعِ خاطر اور بطیبِ خاطر' دلی آمادگی کے ساتھ بھی اور جبری طور پر بھی۔ کسی کا جی چاہے یا نہ چاہے اسے اس کی اطاعت تو کرنی ہے۔

(۳) سورۂ حم السجدہ (آیت ۱۱) میں ''طَوْعًا اَوْ كَرْهًا'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی حرفِ عطف ''وَ'' کے بجائے ''اَوْ'' لایا گیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں

ایک دوسرے کی ضِد اور مدِّ مقابل ہیں۔ فرمایا گیا:

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ

کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین دونوں کو حکم دیا کہ چلے آؤ‘ طوعاً یا کرہاً‘ چاہے اپنی مرضی سے‘ چاہے مجبوری سے۔ یہ احکام اور قوانین ہیں جو ہم نے تمہارے لیے طے کر دیے ہیں‘ اب چاہے اپنی دلی خواہش سے اس پر عمل پیرا رہو چاہے جبراً ان پر عمل کرو‘ بہر حال یہ تو تمہیں کرنا ہی ہے!

ایمان اور اطاعت کا باہمی تعلق

مذکورہ بالا تین آیات کے بعد ایک آیت سورۃ الاحزاب کی ملاحظہ فرمالیجیے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ میں دین کے عملی تقاضوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ

”کسی مؤمن مرد اور کسی مؤمن عورت کے یہ شایانِ شان ہے ہی نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ فرما دیں تو پھر بھی اپنے معاملے میں ان کے پاس کوئی اختیار باقی رہ جائے۔“

یعنی اگر یہ احساس بھی اُبھرے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے بعد بھی میرے پاس کچھ اختیار اور چوائس موجود ہے تو پھر ایمان کہاں رہا؟ اس سے تو ایمان کی نفی ہو گئی۔ جب اللہ اور اس کے رسول کو مانا ہے تو اپنا اختیار ختم ہو گیا۔ ہاں جب تک کوئی حکم نہ آئے‘ یا فرض کریں حکم تو موجود ہے لیکن آپ کے علم میں نہیں آیا تو آپ کا اختیار برقرار ہے۔ آپ اللہ کے ہاں اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کر سکیں گے اور جن کے ذمہ آپ تک یہ حکم پہنچانا تھا وہ مسئول ٹھہریں گے۔ لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ اللہ کا حکم ہے‘ یہ اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے‘ یہ سمجھنا کہ اب بھی اس معاملے میں میرا اختیار باقی ہے‘ ایمان کے منافی طرزِ عمل ہے۔ آیت کا آخری ٹکڑا ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

''اور جوکوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا (تو وہ جان لے کہ) وہ تو بڑی صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔''

اللہ تعالیٰ مجھے' آپ کو اور تمام اہلِ ایمان کو اس سے بچائے۔

ہر انسان کی انفرادی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ حالات و کیفیات' خواہ خوشگوار ہوں یا ناگوار' اس پر وارد ہوتی ہیں' اگرچہ یہ اسباب و وسائل کے ایک طویل سلسلے کے ذریعے سے اس تک پہنچیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے تمام اعضاء و جوارح سے کچھ نہ کچھ صادر یا خارج ہوتا ہے۔ ہم زبان سے بات کرتے ہیں تو اس کے لیے ہمارے دماغ کا ایک بڑا حصہ' عضلات کا ایک پورا سلسلہ اور ہماری زبان اور ہونٹ کام کرتے ہیں' تب کہیں جا کر الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پر جو کچھ وارد ہو' خواہ وہ کسی بھی سلسلۂ اسباب سے ہو کر آ رہا ہو' سمجھا جائے کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ درمیان میں عمل کرنے والا ذمہ دار نہیں رہا' وہ اگر ظلم کر رہا ہے تو اسے اس کے ظلم کی سزا دی جائے گی' البتہ ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ بغیر اذنِ رب ہم پر کوئی شے وارد نہیں ہو سکتی۔ لیکن دوسری طرف جو کچھ ہم سے صادر ہو رہا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل کر صادر ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے فانی کا یہ اندازِ تعبیر بہت پسند ہے۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں!

اس شعر میں جبریہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے' اگرچہ ہم اس موقف کو صد فیصد درست نہیں سمجھتے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایک قدرت بھی رکھی ہے اور اسے اختیار بھی دیا ہے کہ ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③﴾ لیکن ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جیسے میر تقی میر نے کہا ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ ایک پورے فلسفیانہ مکتبِ فکر کا نظریہ ہے‘ جسے فانی نے اپنے شعر میں بیان کر دیا ہے‘ لیکن بہرحال ان کے نزدیک انسانی اعمال کا معاملہ یہ ہے کہ ؎

سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں!

اسی کو غنیمت سمجھو کہ تمہیں تمہارے خالق نے اختیار کا ایک احساس تو دیا ہے اور تم یہ محسوس کرتے ہو کہ میں یہ اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔ فانی کے اس اندازِ تعبیر کو اختیار کرتے ہوئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے اعمال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہونا چاہیے۔ ہمارا ہر عمل خواہ وہ آنکھ سے ہو رہا ہو‘ ہاتھ سے ہو رہا ہو یا زبان سے ہو رہا ہو‘ اس کے بارے میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اطاعت کے اس سانچے سے باہر نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اعمال غیر اختیاری طور پر بھی صادر ہو جاتے ہیں‘ مثلاً راہ چلتے کوئی ایسی آواز آپ کے کانوں میں پڑ گئی جس کا بالا رادہ سننا گناہ ہے‘ یا اچانک کسی نامحرم پر نگاہ پڑ گئی‘ لیکن یہی اعمال اگر اپنے ارادہ و اختیار سے کیے جائیں تو ان کی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی آپ کے اختیار کا سانچہ موجود ہے اس میں سے برآمد ہونے والا ہر عمل گویا اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔

ارادہ و عمل کے اختیار کے بارے میں ایک متوازن نقطۂ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں جو اختیار حاصل ہے وہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے جتنا عام آدمی سمجھتا ہے‘ بلکہ ہماری مجبوری کا پہلو بھی یقیناً بہت بڑا ہے۔ مثلاً ہمارا genetics کا نظام ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں جو جینز (genes) ملے ہیں جن سے ہمارے جسمانی نقش و نگار اور ہماری شخصیت کے خدوخال تیار ہوئے ہیں‘ وہ ہمارے خالق کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور ہمیں اس معاملہ میں کسی انتخاب و اختیار کا حق نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اعتبارات سے ہم مجبور ہیں‘ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی شخصیت میں اختیار کا ایک عنصر بہرحال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ عنصر جس مقدار میں رکھا ہے اسی نسبت سے وہ اس کا محاسبہ کرے گا۔

''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے جو بھی اختیار دیا ہے اسے اپنے اختیار سے اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔

اب ظاہر بات ہے کہ اطاعت پر ہی ایمانِ حقیقی کا دار و مدار ہے۔ اگر اطاعت موجود ہے تو ایمان موجود ہے' اور اگر اطاعت نہیں ہے تو ایمان بھی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہاں بات حقیقی ایمان کی ہو رہی ہے نہ کہ قانونی ایمان کی' جس کی بنیاد پر ہم کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہماری ایک سماجی ضرورت اور مجبوری ہے کہ ہم دنیا میں کسی شخص کو قانونی طور پر مسلمان قرار دینے کے لیے ان ظاہری علامات ہی کا اعتبار کریں گے جو شریعت نے معیّن کی ہیں۔ کوئی شخص اللہ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتا ہو اور دیگر ارکانِ اسلام کی پابندی کرتا ہو یا کم از کم ان میں سے کسی کا منکر نہ ہو تو اسے قانوناً مسلمان سمجھا جائے گا' اس لیے کہ ہم کسی کے دل میں جھانک کر دیکھنے پر تو قادر نہیں ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ایمان کے ان دونوں درجوں کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک طرف یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ ایمان اور اطاعت لازم و ملزوم ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے اطاعت کے بغیر ایمان کی نفی فرمائی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ روایت میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))(۱)

یعنی کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شراب پینے والا حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت ایسے شخص کا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس طرح کی احادیث میں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے۔ دوسری طرف اہلِ سنت کا متفق علیہ موقف یہ ہے کہ ہر فاسق و فاجر کلمہ گو کو بھی قانونی طور پر مسلمان سمجھا جائے گا اور اس کے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاشربۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی ...... واللفظ للمسلم۔

گناہگار ہونے کی بنا پر اس کے ایمان (قانونی) کی نفی نہیں کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''الفقہ الاکبر'' میں جو فقہ کے میدان میں ان کا اصل کارنامہ ہے اور جس میں ریاست اور قانون سے متعلق بنیادی معاملات و مسائل کو طے کیا گیا ہے' یہ اصول بیان کیا ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب بھی کافر نہیں ہے' اس کے قانونی ایمان کی نفی نہیں کی جائے گی۔ ان کا یہ اصول صدفی صد درست ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا' حقیقی ایمان کے لیے اطاعت ناگزیر ہے۔ ایک حدیث کے مطابق' جسے امام نوویؒ نے صحیح قرار دیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولی طور پر یہ طے فرما دیا ہے کہ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

یعنی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہش نفس میں انقیاد پیدا ہو جائے' خواہش نفس دین کے تابع ہو جائے اور اپنے آپ کو اطاعت کے سانچے میں ڈھال دے۔ کھانے کی طلب پیٹ کی طبعی خواہش ہے' لیکن یہ وہی کچھ مانگے جو حلال ہے۔ اسی طرح جنسی تسکین ایک جبلّی خواہش ہے' لیکن اسے صرف اس جائز راستے سے پورا کیا جا رہا ہو جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معیّن کر دیا گیا ہے۔ غرضیکہ جس کسی کو جو کچھ بھی دیا جائے وہ محض طبعی تقاضے یا طبعی محبت کے طور پر نہیں' بلکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معین کردہ حق سمجھ کر دیا جائے۔ اپنے نفس کو بھی محض اس کے طبعی تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ نہ دیا جائے بلکہ اللہ کا معیّن کردہ حق سمجھ کر دیا جائے' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ارشاد فرمایا تھا: ((فَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَلِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَلِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) (۲) ''یقیناً تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے'' —— چنانچہ

(۱) الاربعون النوویة' ح:٤١۔ مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنة' الفصل الثانی۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن صوم الدھر ......

والدین‘ بھائی بہنوں اور بیوی بچوں میں سے جس کسی کو بھی کچھ دیا جائے وہ اس کا حق سمجھ کر دیا جائے اور وہی کچھ دیا جائے جو اللہ نے معین کر دیا ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی روایت کرتے ہیں:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ))(۱)

’’جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لیے کی‘ کسی سے بغض رکھا تو اللہ کے لیے رکھا‘ کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لیے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو اللہ کے لیے روکا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔‘‘

ایمان اور عمل صالح کا جس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اس کی صراحت اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ))(۲)

یعنی اس شخص کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں جس نے اس کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال کر لیا —— وہ قرآن کی لاکھ تعظیم کرے‘ اسے چومے چاٹے‘ سر پر اٹھائے‘ اسے اعلیٰ جزدان میں لپیٹے‘ لیکن اگر اس نے کسی ایسی چیز کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا ہے جسے قرآن نے حرام ٹھہرایا ہے تو اس کا کوئی ایمان نہیں۔ یہ چند احادیث نمونہ مشتے از خروارے کا مصداق ہیں‘ ورنہ اس مضمون کی احادیث کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اسی بات کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی ایک آیت ملاحظہ کیجیے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران)

’’اللہ کا حق ہے لوگوں پر اُس کے گھر کا حج کرنا جو کوئی بھی اس کی طرف سفر کی مقدرت رکھتا ہو۔ اور جو کفر کرے تو اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔‘‘

یعنی جو مقدرت کے باوجود حج نہ کرے وہ اصل حقیقت کے اعتبار سے گویا کفر کر رہا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب السنۃ‘ باب الدلیل علٰی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

(۲) سنن الترمذی‘ کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء فیمن قرأ حرفا من القرآن مالہ من الاجر۔

اسی طرح یہ مشہور حدیث آپ نے یقیناً سنی ہوگی:

((مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ)) (۱)

''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے کفر کیا۔''

نماز اللہ کی طرف سے عائد کردہ ایک فریضہ ہے' جو کوئی اس کو چھوڑ رہا ہے وہ درحقیقت کفر کر رہا ہے' اگرچہ قانونی طور پر اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقی کفر اور قانونی کفر میں بھی فرق ہے۔ جس طرح حقیقی ایمان اور قانونی ایمان میں فرق ہے۔ ان چاروں چیزوں کو گڈمڈ کر دینے سے بہت سے فسادات پیدا ہو جاتے ہیں اور بہت سے فتنے کھڑے ہو جاتے ہیں' جیسا کہ خوارج اور معتزلہ جیسے فتنے اسی وجہ سے پیدا ہوئے۔

اب اس ''اطاعت'' کے ضمن میں چند بنیادی باتیں مزید نوٹ کر لیجیے:

(۱) اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت : اطاعت اصلاً اللہ کی اور عملاً رسول ﷺ کی ہے۔ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہے' نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے۔ اس معاملے میں بھی بڑے فرق و امتیاز کی ضرورت ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت ابھی ہمارے سامنے آ جائے گی۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (آیت ۶۴)

''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اِذن سے۔''

یعنی کسی رسولؐ کی اطاعت اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہے' بلکہ اُس کی اطاعت اللہ کے رسول کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ رسول' اللہ کا نمائندہ ہے جو انسانوں تک اللہ کا حکم پہنچاتا ہے۔ چونکہ انسانوں تک اللہ کا حکم براہِ راست نازل نہیں ہوتا' لہٰذا ''اَطِیْعُوا اللّٰهَ'' پر عمل ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اطاعت اصل میں اللہ کی ہے اور رسول کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے' جیسا کہ فرمایا گیا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰)

---

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی' ح: ۸۵۸۷۔ خلاصۃ الاحکام للنووی: ج۱' ص ۲۴۸۔ تخریج الاحیاء للعراقی' ج۱' ص ۲۰۱۔ التلخیص الحبیر لابن حجر: ج۲' ص ۷۱۹۔

''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔''

اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام میں سے ایک ایک رسول کا تذکرہ آیا ہے اور ہر رسول کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!'' وہاں اللہ کے ساتھ لفظ اطاعت نہیں آیا' کیونکہ رسول کی اطاعت بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی اطاعت ہے۔ چنانچہ وہاں پر اطاعت کو رسول کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے اور اللہ کے ساتھ صرف لفظ ''تقویٰ'' لایا گیا ہے۔

رسول ﷺ کی یہ اطاعت کس درجے مطلوب ہے اور ایمان حقیقی کے اعتبار سے اس کا معیار کیا ہے' اس کے لیے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ ملاحظہ کیجیے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

''تو (اے محمد ﷺ) آپ کے ربّ کی قسم یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ ان تمام معاملات میں جو ان کے مابین اٹھ کھڑے ہوئے ہوں آپ کو حکم تسلیم نہ کریں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس کے بارے میں دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے خوشی سے قبول کریں۔''

رسول ﷺ کے حکم کو ردّ کر دینا اور آپ ؐ کی نافرمانی کرنا تو بہت دور کی بات ہے' جو کھلم کھلا بغاوت ہے' لیکن طرزِ عمل اگر یہ ہو کہ رسولؐ کا حکم مان بھی لیا اور اس پر عمل بھی کر لیا لیکن طبیعت میں کسی انقباض' ناگواری اور تنگی کا احساس ہوا تو یہ کیفیت بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت پیاری اور بڑی جامع حدیث صحیح بخاری میں آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى))

''میری اُمت پوری کی پوری جنت میں جائے گی' سوائے اس کے جو خود انکار کر دے!''

قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّاْبٰى؟

صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ) ایسا کون ہے جو (جنت میں جانے سے) انکار کرے؟

قَالَ: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی))(۱)

فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے گویا (جنت میں جانے سے) خود انکار کر دیا۔''

تو معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کا شاہ درہ رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔

(۲) حدیثِ رسولؐ کا مقام: رسول ﷺ کے حکم کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ رسولؐ کا حکم وحی جلی پر مبنی بھی ہو سکتا ہے اور وحی خفی پر بھی۔ وحی جلی قرآن ہے' جسے وحی متلو بھی کہا جاتا ہے' یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور وحی خفی حدیثِ رسولؐ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ رسولؐ کا حکم صرف وہی شمار نہیں کیا جائے گا جو قرآن میں ہو' بلکہ رسولؐ ایسا حکم بھی دے سکتے ہیں جو وحی خفی پر مبنی ہو۔ یہ نکتہ اہلِ سُنّت اور منکرینِ سنت کے مابین حد فاصل ہے۔ اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی جلی کی طرح وحی خفی کو ماننا بھی ضروری ہے اور رسولؐ کی اطاعت بھی بجائے خود مستقل اطاعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں رسول ﷺ کے لیے لفظ ''اَطِیْعُوْا'' کی تکرار وارد ہوئی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

''اے ایمان والو' حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے والیانِ امر کا۔''

یہاں اللہ کے بعد رسولؐ کے ساتھ بھی ''اَطِیْعُوْا'' کے لفظ کو دہرایا گیا ہے' لیکن اولی الامر کے لیے لفظ ''اَطِیْعُوْا'' نہیں دہرایا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی اطاعت بھی اپنی جگہ مستقل بالذات اطاعت ہے اور ان کی ذمہ داری صرف اللہ کے حکم کو پہنچا دینا ہی نہیں ہے۔

انکارِ حدیث اس دور کا خاصا بڑا فتنہ ہے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ اس کا جلد شکار ہو جاتے ہیں' کیونکہ مغربی افکار کے زیر اثر اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ۔

باعث ان کے ذہن پہلے سے اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ احادیثِ رسولؐ کے بارے میں ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ یہ ہم پر کچھ زیادہ ہی قدغنیں عائد کرنے والی چیزیں ہیں۔ چنانچہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں احادیثِ رسولؐ سے اِباء کا جذبہ عام طور پر پہلے سے موجود ہوتا ہے اور یہ لوگ ''گوشِ حقیقت نیوش'' سے منکرینِ حدیث کی باتوں کو سنتے ہیں اور اس سے فوری اثر قبول کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک حدیث ملاحظہ کیجیے۔ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ ' اَلَا یُوْشِکُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَقُوْلُ: عَلَیْکُمْ بِھٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْہِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْہُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْہِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْہُ' ...... وفی روایۃ الترمذی: وَاِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کَمَا حَرَّمَ اللّٰہُ))(۱)

''لوگو آگاہ ہو جاؤ' مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اسی کی مانند ایک اور شے بھی! دیکھو ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوا لوگوں سے کہہ رہا ہو کہ لوگو' تم پر بس اس قرآن کی پابندی لازم ہے' جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو......'' اور ترمذی کی روایت میں ہے: ''جان لو کہ جس طرح اللہ نے کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں اسی طرح اللہ کے رسول نے بھی کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ ''اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ'' —— یہ الفاظ اس حقیقت پر نصِ قطعی کا درجہ رکھتے ہیں کہ وحی جلی (قرآن) کے علاوہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو ایک وحی خفی بھی عطا ہوئی ہے اور وہ اپنی قطعیت کے اعتبار سے قرآن کے مثل ہے۔ اسی طرح ''اِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کَمَا حَرَّمَ اللّٰہُ'' کے الفاظ سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ حدیثِ رسول ﷺ احکامِ شریعت کا اپنی جگہ پر ایک مستقل ذریعہ اور مستقل شعبہ ہے۔ اس اعتبار سے رسول ﷺ کی اطاعت' خواہ وہ

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب فی لزوم السنۃ۔ ومسند احمد' ح:۱۶۵۴۶۔ وسنن الترمذی' کتاب العلم عن رسول اللہ ﷺ' باب ما نھی عنہ ان یقال عند حدیث النبی ﷺ۔

وحی جلی پر مبنی ہو یا وحی خفی پر' بہر حال لازم ہے اور اس ضمن میں ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح مسند احمد' سنن ابی داؤد' ابن ماجہ' ترمذی اور بیہقی میں حضرت ابورافع ؓ سے روایت ہے:

((لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاْتِيْهِ اَمْرٌ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ: لَا اَدْرِيْ، مَا وَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ))(۱)

''ایسا نہ ہو کہ میں پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی آرام دہ نشست پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کو میرا کوئی حکم پہنچے' جو میں نے کوئی کام کرنے کو کہا ہو یا کسی شے سے روکا ہو تو وہ کہے: میں نہیں جانتا' ہم تو بس اُسی شے کی پیروی کریں گے جو ہم کتاب اللہ میں پاتے ہیں۔''

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو خبردار کیا ہے جو بڑے مرفّہ الحال اور بڑے خوشحال ہوں گے' بڑے اچھے حالات میں بیٹھے ہوئے ہوں گے اور وحی جلی اور وحی خفی کے مابین تفریق کر کے حدیثِ رسولؐ کا استخفاف کریں گے۔ یہ طرزِ عمل بوریا نشینوں کا نہیں ہوگا' بلکہ اونچی سطح کے لوگ ہی اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔

(۳) <u>رسولؐ کے حکم اور رائے میں فرق</u>: اس ضمن میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ رسولؐ کے بھی حکم' مشورہ اور رائے میں فرق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت مشکل مسئلہ ہے کہ اس فرق کا تعین کس طرح کیا جائے۔ یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مشکل نہیں تھا' لیکن آپؐ کے بعد اس اشکال کے حل کے لیے اُمت کے بہترین دماغوں نے سوچ بچار کی ہے۔ صحابہ کرام ؓ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ آپؐ سے دریافت کر لیتے تھے کہ حضورؐ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ یہ بات جو آپؐ فرما رہے ہیں آیا یہ اللہ کا حکم ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے یا یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے؟ آیا ہمیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر بعض صحابہ کرام ؓ نے آپؐ

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب العلم عن رسول اللہ ﷺ' باب ما نھی عنه ان یقال عند حدیث النبی ﷺ ـ وسنن ابی داوٗد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔ وسنن ابن ماجه' المقدمة' باب تعظیم حدیث رسول اللہ ﷺ ......

سے عرض کیا کہ اس جگہ جو آپؐ نے فوجی پڑاؤ لگایا ہے اگر تو یہ از روئے وحی ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' لیکن اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکیں۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس اشکال کے حل کے لیے فقہائے کرام کو بہت محنت کرنا پڑی ہے۔

یہاں ہم حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ کو اصولی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حدیث ''تابیرِ نخل'' بہت مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ اہلِ مدینہ کھجور کے ضمن میں مصنوعی زرپاشی (artificial pollination) کا اہتمام کرتے تھے' یعنی مذکر کھجور کے گابھے کو مونث کھجور کے گابھے کے نزدیک لے آیا جاتا تاکہ زرپاشی کا عمل زیادہ ہو اور اس طرح زیادہ پھل حاصل کیا جا سکے۔ یہ چیز ان کے تجربے میں تھی۔ رسول اللہﷺ نے انہیں یہ عمل کرتے دیکھا تو فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرتے تو شاید بہتر ہوتا۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے اُس سال مصنوعی افزائشِ نسل کا یہ عمل نہیں کیا' لیکن اس کے نتیجے میں فصل کم ہوگئی۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ آپﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ ہم اپنے تجربے کی بنا پر یہ عمل کیا کرتے تھے' مگر اس بار آپؐ کے فرمانے سے ہم نے ایسا نہیں کیا' لیکن اس سے فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ' اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِهٖ' وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِن رَّأْیٍ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) (۱)

''بلاشبہ میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اسے مضبوطی سے تھامو اور اگر تم سے میں کوئی بات اپنی رائے کی بنا پر کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں۔''

یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے دینی معاملات اور سائنسی ترقی سے متعلق معاملات کی نوعیت میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نبی اکرمﷺ سائنس

(۱) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكره من معايش۔ راوی : نافع بن خدیج ؓ۔

پڑھانے آئے تھے نہ زراعت کے طور طریقے سکھانے‘ بلکہ ان کا اصل موضوع انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانوں کی نظری اور عملی ہدایت تھا۔ چنانچہ جو چیز آپ ﷺ کی طرف سے اس ضمن میں دی جائے اس کو لے لینا اور مضبوطی سے تھامنا لازم ہے‘ لیکن جن معاملات کا تعلق امورِ دینیہ سے نہیں بلکہ امورِ طبیعیہ سے ہے ان کے ضمن میں نبی ﷺ اگر اپنی ذاتی رائے پیش کریں تو اس کا تسلیم کرنا بھی واجب نہیں‘ کجا یہ کہ اس پر عمل کرنا واجب ہو۔ مثلاً یہ کہ بارش کیسے ہوتی ہے؟ زلزلے کیسے آتے ہیں؟ دن اور رات کیسے نکلتے ہیں؟ سورج اور چاند کا کیا نظام ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ان چیزوں کا تعلق امورِ تکوینیہ اور امورِ طبیعیہ سے ہے‘ نہ کہ امورِ دینیہ اور امورِ تشریعیہ سے۔ ایسے امور کی جو توجیہہ بھی رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں فرمائی وہ اس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھی اور اُس وقت اس سے زیادہ کوئی بات بتانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ انسانی ذہن ابھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا کہ ان حقائق کا ادراک کر سکتا۔ اس کے لیے تو اگر پہلے فزکس‘ کیمسٹری‘ جیالوجی اور اسٹرانومی جیسے علوم پڑھائے جاتے تب کہیں جا کر وہ چیزیں لوگوں کے ذہن کی گرفت میں آتیں جو سائنسی ترقی کی وجہ سے آج ہمارے علم میں ہیں — اور اللہ کے رسولؐ اس کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ نے اُس دور کی علمی سطح کے مطابق لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان معاملات سے متعلق جو کچھ فرمایا‘ ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہی تعبیرات ہم بھی اختیار کریں۔ البتہ جہاں تک احکام کا تعلق ہے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو‘ یہ حلال ہے یہ حرام ہے‘ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے‘ یہ واجب ہے‘ یہ فرض ہے‘ تو اس ضمن میں حضور ﷺ کا ہر فرمان ہمارے لیے ہمیشہ واجب التعمیل رہے گا‘ اِلّا یہ کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ حضور ﷺ کی ذاتی رائے یا مشورہ تھا‘ مستقل حکم نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرام اور صحابیات (رضوان اللّٰہ علیھم وعلیھن اجمعین) کو جو تربیت دی تھی اس میں کس درجے گہرائی تھی اور ان میں سے نہ صرف وہ جو چوٹی کے لوگ تھے بلکہ نچلے

طبقات سے تعلق رکھنے والے صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم میں بھی کتنا گہرا فہم وشعور پیدا ہو چکا تھا۔ یہ بات حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے معاملے میں واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کنیز تھیں اور حضرت مغیثؓ بھی ایک غلام تھے۔ دونوں کے آقاؤں کی اجازت سے ان دونوں کے مابین نکاح کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ نے آزاد کر دیا تو ان کی معاشرتی حیثیت حضرت مغیثؓ سے برتر ہو گئی۔ آزاد ہونے کے بعد عورت کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اس نکاح کو جو اُس وقت ہوا تھا جب کہ وہ کنیز تھی' چاہے تو برقرار رکھے اور چاہے تو اس سے آزادی حاصل کر لے۔ حضرت بریرہؓ نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے حضرت مغیثؓ کے نکاح میں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت مغیثؓ کو ان سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے پہلے تو براہِ راست بریرہؓ کی خوشامد کی کہ وہ یہ تعلق نہ توڑیں' لیکن جب بات نہ بنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر فریاد کی۔ حضورؐ نے حضرت بریرہ کو بلا کر فرمایا کہ اے بریرہ کیا حرج ہے اگر تم مغیث ہی کے گھر میں رہو! اس پر حضرت بریرہؓ نے فوراً جو سوال کیا وہ یہ تھا کہ حضورؐ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا حکم نہیں بلکہ مشورہ ہے تو بریرہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ میں اس مشورے پر عمل نہیں کر سکتی! تو یہ ہے وہ باریک اور نازک سا فرق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور آپؐ کے مشورے کے مابین حضرت بریرہؓ نے روا رکھا' جو ایک ادنیٰ کنیز تھیں اور اگر یہ واقعہ احادیث میں نہ آیا ہوتا تو شاید ہم میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا ہوتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کوئی بریرہؓ نامی کنیز بھی تھی' لیکن یہ واقعہ ایسا ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے ایسی ابدی رہنمائی ہے کہ اب اس کے حوالے سے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

تو اطاعت کے ضمن میں میں نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ اطاعت اصلاً اللہ کی ہے لیکن عملاً رسولؐ کی ہے۔ پھر یہ کہ اللہ کے رسول کی یہ اطاعت ہر حکم میں واجب ہے' وہ حکم وحی جلی پر مبنی بھی ہو سکتا ہے اور وحی خفی پر بھی۔ البتہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ان کے مشورے اور رائے میں فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔

"اولی الامر" کی اطاعت

حکم اور اطاعت ہی کے ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد "اولی الامر" کی اطاعت کا معاملہ آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (النساء:۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور والیانِ امر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر باہم جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسولؐ کی طرف اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔"

یہ آیت مبارکہ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی اہم ترین آیات میں شمار ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر جو دستوری اور قانونی نظام قائم کیا جائے گا اس کے لیے راہنمائی کا یہ گویا سب سے بڑا مخزن اور منبع و سرچشمہ ہے۔ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کے بارے میں تو ہم گفتگو کر چکے ہیں' یہاں اب اولی الامر کی اطاعت کے معاملے کو تھوڑا سا تجزیہ کر کے سمجھ لیا جائے۔

اطاعت کی دو لازمی شرائط

(۱) سب سے پہلی بات یہ کہ یہاں "اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" کے الفاظ آئے ہیں' یعنی اولی الامر جو خود تم (مسلمانوں) میں سے ہوں۔ حاکم اور والئ امر اگر غیر مسلم ہو تو وہ ان الفاظ کا مصداق نہیں ہوگا اور ایسے حاکم کی اطاعت اگر طوعِ خاطر سے کی جائے گی تو اس سے اسلام کی نفی ہو جائے گی۔ غیر مسلم حاکم کی اطاعت مجبوراً تو کی جا سکتی ہے' برضا و رغبت نہیں! مثال کے طور پر اگر کسی غیر مسلم حکمران نے مسلمانوں کا کوئی علاقہ بزورِ شمشیر فتح کر لیا ہو یا کسی نے کسی مسلمان کو جبراً گرفتار کر کے غلام بنا لیا ہو' جیسے افریقہ سے ہزاروں مسلمانوں کو جبری طور پر غلام بنا کر لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر امریکہ لے جایا گیا' تو ایسی

صورت میں ایک مسلمان ایک غیر مسلم کی اطاعت پر مجبور ہے —— لیکن درحقیقت اصل اطاعت جو طوعِ خاطر سے کی جائے اس کے لیے ''مِنۡکُمۡ'' شرطِ لازم ہے۔

(۲) جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مستقل بالذّات ہے' لیکن اولی الامر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے تابع اور اس سے مشروط ہے۔ یہ اطاعت کبھی بھی غیر مشروط نہیں ہو سکتی' بلکہ ہمیشہ سے مشروط رہی ہے اور ہمیشہ مشروط ہی رہے گی۔

''اولی الامر'' کون ہیں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اولی الامر کون ہیں؟ ہم اس کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ اولی الامر معاشرتی نظام میں بھی ہیں اور سیاسی نظام میں بھی۔ چنانچہ گھر کا سربراہ اپنے گھر کے لیے والیٔ امر ہے۔ اسی طرح معاشرتی نظام میں ہر جگہ درجہ بدرجہ ہر شخص کی جو بھی حیثیت ہے' اس کے اعتبار سے وہ اپنے دائرے کے اندر صاحبِ امر ہے۔ لہٰذا اطاعت کا سلسلہ صرف حاکمِ اعلیٰ تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے۔ بیوی کے لیے شوہر والیٔ امر ہے' جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾(النساء:٣٤) کہ نیک بیویاں وہی ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں۔ بیوی کے لیے شوہر کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہے' اِلّا یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے متصادم ہو۔ ایسی صورت میں ((لَا طَاعَةَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِیۡ مَعۡصِیَةِ الۡخَالِقِ)) کا ابدی اصول مدّنظر رکھا جائے گا۔

مزید برآں' ماتحت امراء کا شمار بھی اولی الامر میں ہوتا ہے۔ ایسے امراء رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ہوتے تھے' جیسے کہیں کوئی لشکر بھیجا جاتا تو اس کا کسی کو سپہ سالار مقرر کیا جاتا' کہیں کوئی چھوٹا دستہ بھیجا جاتا تو اس میں بھی کسی کو امیر بنایا جاتا۔ اس ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعات آپ کے سامنے آ جائیں۔ غزوۂ اُحد میں ۳۵ حضرات کی طرف سے اپنے امیر حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حکم عدولی کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کا امیر مقرر کر کے ایک درّے پر متعین کیا تھا اور ان حضرات کو حکم دیا تھا کہ آپ

لوگ اس درّے کو مت چھوڑیں خواہ ہمیں شکست ہو جائے‘ ہم سب قتل ہو جائیں اور آپ لوگ دیکھیں کہ پرندے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ ان حضرات نے جب اپنے لشکر کو فتح سے ہمکنار ہوتے اور دشمن کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھا تو درّے کو چھوڑ کر جانے لگے‘ کیونکہ ان کے خیال میں حضور ﷺ نے درّے کو نہ چھوڑنے کا جو حکم دیا تھا وہ شکست کی صورت میں تھا۔ لوکل کمانڈر حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ انہیں روکتے رہے‘ لیکن ان پچاس میں سے ۳۵ صحابہ کرامؓ درّے کو چھوڑ گئے۔ ماتحت امیر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوری طور پر یہ دی گئی کہ جیتی ہوئی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا گیا۔ سورۂ آل عمران میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ (آیت ۱۵۲)

’’اور اللہ نے تو تمہیں اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب تم انہیں اس کے حکم سے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑے اور تم نے نظم کو توڑا اور تم نے نافرمانی کی‘ بعد اس کے کہ میں تم کو وہ چیز دکھا چکا جو تمہیں بہت محبوب ہے (یعنی فتح)۔‘‘

یہاں نافرمانی سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں‘ بلکہ ماتحت کمانڈر کی نافرمانی ہے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تو انہوں نے تاویل کر لی تھی۔

اسی طرح ایک بار رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ کہیں بھیجا اور ان میں سے ایک صاحب کو اس کا امیر مقرر کیا۔ یہ صاحب ذرا جلالی مزاج کے مالک تھے‘ کسی بات پر اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے اور یہ ناراضگی اس حد تک پہنچی کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ایک بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے گڑھا کھود دیا تو ان سے کہا کہ اس کے اندر لکڑیاں جمع کرو۔ لکڑیاں جمع کر دی گئیں تو انہیں آگ لگانے کا حکم دیا۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو ساتھیوں سے فرمایا کہ اب اس آگ کے اندر کود جاؤ! اس پر ساتھیوں نے کہا کہ اس آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد (ﷺ) کا دامن تھاما ہے‘ ہم اس میں داخل ہونے کو تو تیار نہیں ہیں۔ جب واپس آ کر یہ معاملہ

رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضورؐ نے ان کی تصویب کی اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اپنے اس امیر کا حکم مان کر آگ میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ اس لیے کہ یہ خودکشی ہوتی جس کی سزا خلود فی النار ہے۔ چنانچہ ماتحت امراء کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اللہ اور رسول کے حکم کے تابع تھی' اس دائرے سے خارج نہ تھی اور آپؐ کے بعد بھی یہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط رہے گی۔

فقہاءِ کرامؒ کا عظیم کارنامہ

رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ معاملہ اس اعتبار سے بہت کٹھن بن گیا ہے کہ اب قرآن بھی ہمارے سامنے صرف ایک متن کی صورت میں موجود ہے' اللہ ہمارے سامنے بنفس نفیس نہیں ہے' وہ نہ ہمیں براہِ راست حکم دے رہا ہے اور نہ براہِ راست اپنے حکم کی تاویل وتوضیح کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں اللہ کے احکام کی تاویل بھی فرماتے اور اس کی توضیح بھی فرماتے' جو ہر لحاظ سے مستند ہوتی۔ انہیں اس کا اختیار حاصل تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ خود اپنے حکم کے بارے میں بھی وضاحت فرما دیتے تھے کہ میری اس بات کی حیثیت واجب التعمیل حکم کی ہے اور میری یہ بات صرف مشورے کے درجے میں ہے۔ چنانچہ معاملہ بہت سادہ تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ متعین کرنا آسان نہیں رہا کہ قرآن حکیم کے اوامر میں سے کون سے واقعتاً واجب التعمیل ہیں اور کون سے صرف مستحب کے درجے میں ہیں' مثلاً سورۃ الجمعہ میں جو یہ فرمایا گیا کہ جب جمعہ کی نماز ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ ﴿فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (الجمعة: ١٠) تو کیا یہ وجوب کے لیے ہے؟ عام اصول تو یہی ہے کہ ''الامر للوجوب'' لیکن جمعہ کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جانا اور کاروبارِ دنیا میں مصروف ہو جانا لازم تو نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن حکیم کے بعض اوامر ایسے ہیں جو لازم نہیں ہیں' بلکہ ان سے استحباب یا اجازت کا مفہوم نکلتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اقوال کے ضمن میں یہ معاملہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر حدیث کے بارے میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا فرمان ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی سند کیا ہے؟ سند قوی ہے یا ضعیف؟ پھر یہ کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ آیا یہ

آپ ﷺ کا حکم تھا' مشورہ تھا' ذاتی رائے تھی یا اجتہاد تھا؟ اصل میں یہی وہ وِقت تھی جس کے حل کے لیے حضور ﷺ کے انتقال کے بعد سو دو سو برس تک اُمت کے بہترین دماغ انہی چیزوں پر سوچ بچار کرتے رہے۔ وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہاء کی ایک کونسل بنائی۔ ان کا یہ عمل (معاذ اللہ) کوئی مشغلے کے طور پر نہ تھا۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ محض شغل کے طور پر ان کاموں میں لگے رہتے۔ انہیں اس ضرورت کا شدید احساس تھا کہ احکامِ شریعت کی درجہ بندی کی جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کونسی شے فرض ہے' کونسی واجب' کونسی سنت مؤکدہ ہے اور کونسی مستحب کے درجے میں ہے۔ پھر ان احکام کے تعین کے لیے اصول وضوابط معیّن کیے گئے۔ اصولِ فقہ' اصولِ تفسیر اور اصولِ حدیث مقرر ہوئے۔ مختلف فقہی مسالک کے مابین جو اختلافات سامنے آئے وہ ایک فطری بات ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں انسانی ذہن کام کرتا ہے وہاں اختلاف کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ تو اس اعتبار سے یہ بات سمجھ لیجیے کہ اصل میں یہ وہ مشکل ہے کہ جسے حل کرنے کے لیے اسلاف کے بہترین دماغوں نے ایک طویل عرصہ صرف کیا ہے اور اس کا امکان نہیں ہے کہ اب ہم ان حدود سے آگے بڑھ سکیں۔ اب ہمارے پاس کوئی مزید نئی احادیث تو نہیں آ سکتیں' احادیث کا پورا ذخیرہ ان کے سامنے موجود تھا۔ آج ہم بیٹھ کر کوئی نیا ''اسماء الرجال'' بھی گھڑ نہیں سکتے' بلکہ اسلاف نے راویوں کے بارے میں تحقیق وتفتیش کے بعد ان پر جو جرح وتعدیل کی اس پر آج ہمیں اعتماد کرنا ہوگا۔ ہمارا یہ علمی ورثہ جس کا اس قدر وسیع وعریض اثاثہ ہمارے پاس موجود ہے یہ بے بنیاد نہیں ہے' اس کی پشت پر کوئی خواہ مخواہ کی موشگافی کا جذبہ یا شوق کارفرما نہیں تھا' یہ سب کچھ محض مشغلے کے طور پر نہیں کیا گیا' بلکہ یہ دین کی ایک اہم بنیادی اور واقعی ضرورت تھی جس کو ان ائمہ دین نے پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ کو مجدّدین میں شمار کیا گیا ہے۔

اطاعت کی دو عملی صورتیں

رہا یہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اطاعت کا یہ نظام عملاً کیسے چلے گا' تو عملی طور

پر اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں —— اگر تو اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اس کا والیٔ امر' جسے آپ خلیفہ کہیں یا سلطان' اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس اطاعت کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اپنی رائے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے۔ اب یہ کون طے کرے گا کہ خلیفہ کی رائے درست ہے یا نہیں؟ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں اللہ' رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کے حکم کے بعد اصولی طور پر تو یہ طے کر دیا گیا کہ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے مابین تنازعہ ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو' لیکن عملاً اس کا نظام کیا ہوگا؟ والیٔ امر اگر اپنی کسی رائے کے بارے میں کہہ رہا ہو کہ یہ چیز شریعت کے دائرے کے اندر ہے' لیکن کوئی صاحبِ علم یہ کہے کہ نہیں' اس سے شریعت کا فلاں حکم ٹوٹ رہا ہے تو اس کے فیصلے کے لیے کوئی ادارہ' کوئی انسٹیٹیوشن ہونا چاہیے۔ عہدِ حاضر میں خلافت کا نظام جب بھی قائم ہوگا اس میں اہم ترین مسئلہ یہ ہوگا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کون کرے؟ اوّل تو یہ کہ اولی الامر کیسے وجود میں آئیں؟ قرآن مجید نے ہمیں اس کا کوئی نظام نہیں دیا اور اس معاملے کو کھلا رکھا ہے' اس لیے کہ نزولِ قرآن کے وقت معاشرتی ارتقاء (social evolution) کا عمل ابھی جاری تھا اور اس میں انسان کو ابھی درجہ بدرجہ ترقی کرنا تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ منقطع ہو چکا۔ اب کوئی والیٔ امر نبی نہیں ہوگا' لہٰذا معصوم نہیں ہوگا۔ البتہ وہ مسلمانوں میں سے ہوگا اور اس کا تقرر ''عن مشورۃِ المُسلمین'' (مسلمانوں کے باہمی مشورے سے) عمل میں آئے گا۔ اس کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر صاحبِ امر ایک بات کہے اور کچھ اہلِ علم یہ محسوس کریں کہ یہ از روئے قرآن وحدیث غلط ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ معاشرتی ارتقاء کا عمل آج جس مقام تک پہنچا ہے اس میں ریاست کے تین بنیادی اعضاء (basic organs) معیّن کیے گئے ہیں' یعنی مقنّنہ' انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور یہ فرضِ منصبی عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتوں (higher judiciary) کے ذمّے عائد ہوگا کہ وہ اس معاملے کو طے کریں۔ خطا کا امکان اگرچہ وہاں بھی ہے' لیکن بہرحال صاحبِ امر (خلیفہ) اور دستور ساز اسمبلی' جسے

مجلسِ ملی‘ مجلسِ شوریٰ‘ مجلسِ مقننہ‘ مجلسِ اجتہاد‘ کانگریس یا پارلیمنٹ‘ جو نام بھی دیا جائے‘ ان دونوں کے مابین بھی اگر نزاع پیدا ہو جائے تو اسے عدلیہ ہی کو طے کرنا ہوگا۔ اسی طرح قوم کا کوئی فرد اگر یہ سمجھتا ہے کہ مجلس ملی یا مجلس شوریٰ نے یہ جو فیصلہ کیا ہے یہ شریعت کے منافی ہے‘ یا وہ خلیفہ کے کسی فیصلے کے خلاف استغاثہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی عدلیہ ہی سے رجوع کرے گا۔

عملی اعتبار سے دوسری صورت یہ ہے کہ دین کا نظام ہی قائم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسے قائم کرنے کی جدّوجُہد اور محنت کرنا ہوگی‘ اس کے لیے جہاد کرنا ہوگا‘ اوراس جدوجہد کے لیے جماعت بنانا ہوگی۔ ایسی جماعت کا جو امیر ہوگا اس کی حیثیت اولی الامر کی ہوگی۔ اب اس صورت میں بھی جماعت کے اندر کوئی تنازعہ اٹھ سکتا ہے‘ کسی کو امیر جماعت کی کسی رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ یہ اختلاف اگر اس درجے میں ہو کہ بس رائے کا اختلاف ہے تو بات اور ہے‘ اختلافِ رائے کے علی الرغم امیر کا حکم ماننا پڑے گا‘ لیکن اختلاف کی نوعیت اگر یہ ہو کہ کوئی سمجھے کہ جس بات کا حکم دیا جارہا ہے وہ بات شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے‘ اس میں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو گیا ہے تو اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ آخری فیصلہ اس شخص کا اپنا ضمیر ہی کرے گا۔ یہاں کوئی عدالت فیصلہ نہیں کر سکتی‘ کیونکہ یہ ایک جماعتی معاملہ ہے۔ جماعت کی اپنی کوئی علاقائی حدود (territorial jurisdiction) نہیں ہیں‘ کسی علاقے پر اس کا حکم نہیں چل رہا ہے‘ چنانچہ اس کے اندر کسی عدلیہ کا معاملہ نہیں ہوگا‘ بلکہ اختلاف کرنے والے شخص کا اپنا فیصلہ ہی حتمی ہوگا‘ جیسا کہ حضورﷺ نے فرمایا: ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ ...... وَلَوْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتُوْكَ))[1] کہ اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو...... اگرچہ لوگ تمہیں اس کے حق میں فتویٰ دے بھی دیں۔ گویا اصل مفتی تمہارا قلب ہے۔ قلب کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر تمہارا ضمیر مطمئن ہے کہ تم نے اس وجہ سے امیر کا فیصلہ تسلیم نہیں کیا یا جماعت

---

(۱) الاربعون النوویة‘ ح۲۷۔ قال النووی: حدیث حسن رویناہ فی مسندی الامامین احمد بن حنبل والدارمی باسناد حسن۔

ہی سے علیحدگی اختیار کر لی کہ تمہارے نزدیک صاحبِ امر (امیر) نے شریعت کی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اللہ کے ساتھ تمہارا معاملہ صاف رہے گا۔ اور اگر اصل سبب کچھ اور ہے، کوئی تکبر، حسد، طبیعت کا کوئی نشوز پاؤں کی بیڑی بن گیا ہے، یا راستے کی سختیاں ساتھ دینے میں آڑے آ رہی ہیں، آگے چلنے کی ہمت نہیں ہے اور صرف بہانہ بنایا جا رہا ہے تو یہ اللہ کے علم سے باہر نہیں، اس کے ہاں اس پر پکڑ ہوگی اور انسان کو اس کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ لیکن دنیا میں اس کا فیصلہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔ یہ بندے اور رب کے مابین راز رہے گا۔ یہ چند باتیں تھیں جو اس آیۂ مبارکہ کے ذیل میں ہمارے سامنے آ گئیں:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٢﴾ (التغابن)

دین میں ”سمع و طاعت“ کا مقام

اس ضمن میں اب ہم اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۶ کا مطالعہ کرتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٦﴾ (التغابن)

”پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی امکانی حد تک، اور سنو اور اطاعت کرو، اور خرچ کرو اپنے بھلے کے لیے۔ اور جو کوئی بچا دیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات (۱۱-۱۵) کے بارے میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ان میں ثمراتِ ایمانی کا بیان آیا ہے، جن میں سے چار آیات کا تعلق فکر و نظر کی تبدیلی سے ہے، جبکہ صرف ایک آیت عمل سے متعلق ہے، جس پر ہم نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے زوردار دعوتِ عمل دی جا رہی ہے۔ صرف ایک لفظ ”فَاتَّقُوا اللّٰهَ“ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ دونوں کو سمو لیا گیا ہے اور اس کے بعد سارا زور دعوتِ عمل اور اس میں بھی خاص طور پر

اطاعت پر ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں فرمایا گیا: ''وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا'' (سنو اور اطاعت کرو!) اطاعت کے ضمن میں اگرچہ اس سے پہلے پوری ایک آیت گزر چکی ہے' جس پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں' لیکن اس آیۂ مبارکہ میں بھی ''وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا'' کے الفاظ میں اطاعت کی زوردار دعوت ہے۔ ان الفاظ کے حوالے سے چار باتیں ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں۔

قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح

پہلی بات یہ کہ ''سمع و طاعت'' قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آیت زیر درس کے علاوہ چار مقامات پر یہ جوڑا اسی طرح آیا ہے:

(۱) سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کے بارے میں روایت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج میں عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ اگرچہ پوری کی پوری مدنی سورت ہے' لیکن اس کی آخری دو آیات اس اعتبار سے مکّی شمار ہوں گی کہ واقعۂ معراج مکی دور میں پیش آیا جس کے دوران اُمت کے لیے تحفے کے طور پر یہ دو آیتیں دی گئیں۔ ان میں سے پہلی آیت (آیت ۲۸۵) جس کا آغاز ''اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ'' کے الفاظ سے ہوتا ہے' کے آخری الفاظ ہیں:

وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ٭ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸۵﴾

''اور وہ کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور ہم نے تسلیم کیا' ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اے ہمارے ربّ' اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔''

سورۃ البقرۃ کے بارے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ شریعتِ اسلامی کا نقطۂ آغاز ہے۔

(۲) شریعت اسلامی کا نقطۂ تکمیل یا نقطۂ عروج سورۃ المائدۃ ہے۔ اس کی آیت ۷ میں فرمایا گیا:

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫

''اور یاد رکھنا اللہ کی نعمت کو جو (شریعت کے حوالے سے) تم پر ہوئی ہے اور اس کا عہد (بھی یاد رکھنا) جس میں اللہ نے تم کو باندھ لیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی!''

(۳) سورۃ النور کی آیت ۵۱ میں فرمایا گیا:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ

''یقیناً ایمان والوں کی بات تو یہی ہے کہ جب بلایا جائے ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے مابین تو کہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور حکم مان لیا ہے۔''

(۴) اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں یہود کے طرزِ عمل کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ......

''اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا اور (اے نبی ﷺ) سنیے اور ہم پر نظر کیجیے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور درست ہوتا......''

تو یہ چار مقامات ہیں جہاں ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' کے الفاظ ایک جوڑے کی شکل میں آئے ہیں۔

اب ذرا اس کا منفی پہلو بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ کفار کی ایک روش تو یہ تھی کہ سننے ہی سے انکاری تھے' جیسا کہ سورۃ حٰم السجدۃ کی آیت ۲۶ میں الفاظ آئے ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝

''اور کافر (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ اس قرآن کو مت سنو اور (جب محمد ﷺ اسے پڑھ کر سنا رہے ہوں تو) اس میں شور و غل کرو' شاید کہ (اس تدبیر سے) تم غالب ہو جاؤ!''

اس صورت میں تو ''سمع'' ہی کی نفی ہو گئی' جبکہ ایک طرزِ عمل وہ تھا جو یہود نے اختیار کر رکھا تھا اور جس کا ذکر قرآن حکیم میں دو بار ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' کے الفاظ میں آیا ہے'

یعنی ’’ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی‘‘۔ یہود کے یہ الفاظ سورۃ البقرۃ کی آیت ۹۳ میں بھی نقل ہوئے ہیں اور سورۃ النساء کی آیت ۴۶ میں بھی۔ مؤخر الذکر آیت کا دوسرا ٹکڑا اوپر بیان ہوا ہے۔ آیت کے پہلے حصے میں یہود کا طرزِ عمل بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں کہ یہ کہتے ہیں: ’’سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا‘‘ حالانکہ انہیں کہنا چاہیے تھا ’’سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا‘‘۔ تو ’’سمع وطاعت‘‘ درحقیقت قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔

’’سمع وطاعت‘‘ کا ایک اہم تقاضا —— فوری تعمیل

دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ اس اصطلاح اور اس اسلوب سے پیش نظر کیا ہے! ’’وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا‘‘ (سنو اور اطاعت کرو!) کے الفاظ میں درحقیقت فوری (immediate) اطاعت کا حکم ہے‘ یعنی سنتے ہی اطاعت کا لازم ہو جانا۔ ایک درمیانی طرزِ عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات سن تو لی جائے‘ لیکن اگر اپنی سمجھ میں آئے تو مان لی جائے ورنہ رد کر دی جائے‘ اس طرح ’’سننے‘‘ اور ’’ماننے‘‘ کے درمیان ’’اپنی سمجھ‘‘ حائل ہو جاتی ہے۔ اس طرزِ عمل کا تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گویا آپ اس حکم کو نہیں مان رہے بلکہ اپنی سمجھ کی اطاعت کر رہے ہیں‘ کیونکہ آپ نے صرف اس حکم کو مانا ہے جو آپ کی سمجھ میں آ گیا۔ گویا اصل مطاع تو آپ کی سمجھ ہوئی۔ یہ اسی طرح کا طرزِ عمل ہے جیسا یہ کہ اگر اللہ کا کوئی حکم آپ کے نفس کو بھی پسند آیا اور آپ اس پر عمل پیرا ہو گئے تو آپ نے اطاعت‘ اللہ کی نہیں بلکہ اپنے نفس کی کی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تو بلا استثناء ہونی چاہیے‘ خواہ سمجھ میں آئے خواہ نہ آئے۔ تو ’’وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا‘‘ ایک ایسا اسلوب ہے جس میں فی الفور اطاعت کا تقاضا ہے‘ یعنی سنتے ہی اس پر عمل کرو۔ اپنی سمجھ میں آنے یا نہ آنے کا سوال ہی درمیان سے نکل جانا چاہیے۔ میٹرک کے زمانے میں ہم نے ایک نظم ‘‘Charge of the Light Brigade’’ پڑھی تھی۔ اس میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ چھ سو سواروں پر مشتمل فوج کے رسالے کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب ان میں سے ہر شخص کو معلوم تھا کہ کسی نے غلط حکم دیا ہے:

Someone had blundered

کیونکہ صورت حال اس طرح کی تھی کہ ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے توپیں لگی ہوئی تھیں:

Cannon to right of them,
Cannon to left of them,
Cannon in front of them,
Volleyed and thundered.

اور حملے کی صورت میں ان چھ سو سواروں کی ہلاکت یقینی تھی ——— لیکن

Theirs not to make reply.
Theirs not to reason why.
Theirs but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت اس حکم کی حکمت دریافت کریں اور اپنے دلائل پیش کریں کہ یہ حکم غلط دیا گیا ہے، بلکہ آرمی ڈسپلن اس طرزِ عمل کا نام ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی فوری تعمیل کرو اور اس میں موت آتی ہے تو آئے! تو یہ ہے درحقیقت وہ طرزِ عمل کہ جو ''وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا'' کے جواب میں مطلوب ہے۔

سمع، طاعت پر مقدّم کیوں؟

اس سلسلے میں تیسری لائق توجہ بات یہ ہے کہ ''سمع وطاعت'' میں ''سمع'' مقدم ہے ''طاعت'' پر۔ ویسے تو طبعی ضابطہ بھی یہی ہے کہ آپ کوئی بات سنیں گے تو اس کی اطاعت کریں گے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ''سمع وطاعت'' کا حکم دیتے ہوئے ''وَاسْمَعُوْا'' کو کیوں نمایاں کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ اقامت دین کی جدّوجہد ایک اجتماعی شکل اور جماعتی ہیئت ہی میں ممکن ہے اور اس سلسلے کے تمام احکام سے بروقت آگاہی کے لیے اس جماعتی نظم سے وابستگی اور پیوستگی ضروری ہے۔ اگر آپ اس جماعتی نظم سے وابستہ نہیں ہیں تو ''سمع'' ہی نہیں ہوگا، نتیجتاً ''طاعت'' کی نوبت کہاں آئے گی؟ رسول اللہ ﷺ کے احکام خطباتِ جمعہ میں صادر ہوتے تھے۔ اُس وقت آج کی طرح ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، ٹیلی فون، ٹیلی گرام اور انٹرنیٹ جیسے رسل و رسائل اور ابلاغ

کے ذرائع تو تھے نہیں۔ اب جو شخص جمعہ میں آتا ہی نہ ہو اور اس طرح ان احکام کے سننے ہی سے محروم رہے تو وہ اطاعت کیسے کرے گا! چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ جمعہ کے دوران منبر پر یہ فرمایا کہ یہ لوگ جو جمعہ میں شرکت سے رہ جاتے ہیں وہ اس طرزِ عمل سے باز آ جائیں' ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔ یعنی ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫﴾ (البقرۃ:۷) کے الفاظ میں بدترین کافروں کے لیے جو سزا سنائی گئی ہے' انہیں وہ سزا ملے گی۔

اسی طرح کوئی انقلابی جماعت جو اسی مقصد (غلبۂ دین) کے حصول کے لیے کوشاں ہے اگر آپ اس سے پیوست نہیں ہیں' اس سے چمٹے ہوئے نہیں ہیں' اس کے نظم کے ساتھ آپ کی وابستگی ہی نہیں ہے تو انقلابی جدّوجُہد سے متعلق احکام و ہدایات آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ہرکارے اور پیادے احکام لیے لیے پھر رہے ہوں اور ایک ایک شخص کو تلاش کر کے ان کی تعمیل کرائیں۔ عدالتی نظام میں اور حکومتی سطح پر تو ایسا ہوتا ہے کہ گھروں پر جا کر سمن کی تعمیل کرائی جاتی ہے' لیکن کسی انقلابی جماعتی نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تو ع ''پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ'' کے مصداق جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے۔ ایک پتا جب تک درخت پر لگا ہوا ہے اسی وقت تک وہ اس درخت کا حصہ ہے۔ درخت کی جڑ سے لے کر اس کی چوٹی کے پتوں تک کے مابین ایک رابطہ قائم ہے۔ جڑ کے ذریعے سے جو پانی اور غذا درخت حاصل کرتا ہے وہ اس کے آخری پتے تک بھی پہنچ جاتی ہے' لیکن جب کوئی پتا درخت سے کٹ جاتا ہے تو اب درخت کی غذا سے اسے کوئی حصہ نہیں ملتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر جماعت سے آپ کا تعلق منقطع ہو گیا تو ظاہر بات ہے کہ اب آپ اس کے نظم اور سلک میں نہیں ہیں' بلکہ ایک ایسی پتنگ کی مانند ہیں جس کی ڈور کٹ چکی ہے اور ایک ایسے پتے کی طرح ہیں جو اپنے درخت سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اسی کو پیوستگی کہا جاتا ہے اور اسی کے لیے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں منسلک ہونا' یعنی پرو دیا جانا۔ ہار میں اگر موتی پرو دیے گئے ہیں تو وہ ہار ہے' اور اگر اس کی ڈور ٹوٹ گئی ہے تو وہ ہار نہیں

رہا بلکہ منتشر موتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کے افراد اگر اس کے ساتھ منسلک اور ملتزم ہیں تو وہ صحیح معنوں میں جماعت ہے۔ التزام کے معنی چمٹ جانا ہیں اور ملتزم وہ ہے جو جماعت کے ساتھ چمٹا رہے۔ یہی درحقیقت سمع کو مقدّم رکھنے کا سبب ہے' ورنہ اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہ تھی' کیونکہ یہ بات تو بالکل ظاہر اور understood ہے کہ اطاعت کا مرحلہ آتا ہی سننے کے بعد ہے۔

سمع وطاعت کا لازمی تقاضا —— بیعت

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اس سمع وطاعت کو نبی اکرم ﷺ نے بیعت کی شکل دی ہے۔ حضور ﷺ اگرچہ رسول تھے اور جو کوئی بھی آپؐ پر ایمان لے آتا اس پر' ایمان بالرّسالت کے لازمی تقاضے کے طور پر' آپؐ کی اطاعت فرض تھی۔ اس کے باوجود نظم جماعت میں اس سمع وطاعت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے باقاعدہ بیعت لی۔ اس سلسلہ میں دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ : بِالْجَمَاعَۃِ ' وَالسَّمْعِ' وَالطَّاعَۃِ' وَالْھِجْرَۃِ' وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۱)
>
> ''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم!''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلا حکم التزامِ جماعت کا دیا ہے۔ جماعتی نظم کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی اگر تو اسلامی نظام حکومت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ سمع وطاعت کا تعلق ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس نظامِ حکومت کو قائم کرنے کی جدّوجُہد کے لیے جو جماعتی نظام قائم ہوگا اس کے امیر کے ساتھ وہی تعلق سمع و طاعت ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا حکم سمع یعنی سننے کا اور تیسرا اطاعت کا دیا گیا۔ چوتھی اور

(۱) سنن الترمذی' کتاب الامثال عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔ ومسند احمد' ح ۱۶۵۴۲ و ۱۷۱۳۲ و ۲۱۸۳۵۔

پانچویں چیزیں ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ ہیں۔ ہجرت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ ؟ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)' سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟'' فرمایا: ((اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ)) [۱] ''یہ کہ تم ہر اُس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے ربّ کو پسند نہیں ہے!'' یہ ہے ہجرت — اور نیت یہ رہے کہ اگر اللہ کے دین کا تقاضا ہو تو انسان اپنا گھر بار' اہل وعیال اور مال ومنال سب کچھ اس کی خاطر چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن پہلا قدم یہی ہے کہ جو چیز اللہ کو پسند نہیں ہے' جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے' اس کو چھوڑ دیا جائے' اس سے ترکِ تعلق کر لیا جائے۔ اسی طرح ''وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ'' کے مصداق ترکِ تعلق کی یہ قینچی علائقِ دُنیوی میں بھی چل جانی چاہیے کہ فُسّاق وفُجّار کے ساتھ آپ کی دوستی اور محبتِ قلبی کا تعلق منقطع ہو جائے — اور جہاد فی سبیل اللہ اس کا مثبت پہلو ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں محنت' جدوجہد' ایثار وقربانی' انفاق اور قتال' یہ سب جہاد فی سبیل اللہ ہی کے مدارج ومراتب ہیں۔ لیکن بہرحال نیت میں یہ چیز لازمی طور پر شامل رہنی چاہیے کہ وہ وقت آئے کہ میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگا دوں اور اس راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے سرخرو ہو جاؤں' میری گردن اللہ کی راہ میں کٹ جائے۔ اگر کسی کے دل میں یہ نیت بھی موجود نہیں تو حدیثِ نبویؐ کی رو سے ایسا شخص حالتِ نفاق میں مرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِنْ نِفَاقٍ)) [۲]

''جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اُس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ ہی دل میں اس کی آرزو رکھی تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر ہوئی۔''

ہمارے تصوّرِ دین کی کوتاہی

حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ والی حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے اس وقت کے تصورِ

(۱) سنن النسائی' کتاب البیعۃ' باب ھجرۃ البادی۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

دین کا جائزہ لیجیے تو آپ کو بہت فرق و تفاوت نظر آئے گا۔ ہمارے تصورِ دین میں تو یہ چیزیں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہمارے تصورِ دین میں وہ پانچ چیزیں تو ہیں جنہیں ایک دوسری حدیث میں ارکانِ اسلام فرمایا گیا ہے‘ یعنی کلمۂ شہادت‘ نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ —— لیکن ان پانچ چیزوں کا ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ اس حدیث کے الفاظ ہیں:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ‘ شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں‘ نماز قائم کرنا‘ زکوٰۃ ادا کرنا‘ بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔‘‘

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ ارکانِ اسلام بیان فرمائے ہیں جو ہر مسلمان کو یاد ہیں‘ لیکن دوسری پانچ چیزوں کا حکم بھی محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہی نے دیا ہے‘ تو ان سے بے اعتنائی چہ معنی دارد!

’’اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ‘‘ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو بھی لازم سمجھا جائے۔

صحابہ کرامؓ کی بیعت کے الفاظ اور ان کی تشریح

اس ’’سمع و طاعت‘‘ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت لی وہ اس حدیث میں مذکور ہے:

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ ؓ قَالَ: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ...... (۲)

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان ارکان اسلام ودعائمہ العظام۔ عن عبداللہ بن عمرؓ۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب الاحکام‘ باب کیف یبایع الامام الناس‘ وکتاب الفتن‘ باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورا تنکرونھا۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ ...... واللفظ للمسلم۔

حضرت عبادہ بن صامت (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ: ''ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے'' ...... بَاعَ ۔ یَبِیْعُ بیچنے کو کہا جاتا ہے اور بیعت' اہلِ ایمان کی اللہ کے ساتھ بیع و شراء ہے' جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا گیا:﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ﴾(آیت ۱۱۱)''اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں'' —— لیکن چونکہ اللہ سامنے نہیں ہے لہٰذا یہ بیع و شراء اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔ اور عرب کا دستور یہ تھا کہ کوئی سودا جب مکمل ہو جاتا تھا تو مصافحہ (shake hand) کیا جاتا تھا اور یہ مصافحہ بیعت میں بھی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ ﷺ سے یہ بیعت کس چیز کی تھی؟ اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: عَلَی السَّمۡعِ وَالطَّاعَۃِ ''اس پر کہ سنیں گے اور مانیں گے!'' یہی دراصل وہ جوڑا ہے (سمع وطاعت) جس کے حوالے سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اور جس کا حکم آیۂ زیرِ درس میں ہے: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا۔

اس حدیث میں سمع و طاعت کی تین کیفیات بیان ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ ''فِی الۡعُسۡرِ وَالۡیُسۡرِ'' یعنی ''چاہے تنگی ہو یا آسانی ہو'' ...... یہ نہیں کہ بس آسانی ہی کے اندر اطاعت کریں گے۔ بلکہ چاہے تنگی ہو' مشکل ہو' ہمارے لیے اپنا گزر مشکل ہوا ہو' لیکن بہر حال جب نبی مکرم ﷺ کا حکم آئے گا تو بلا چون و چرا مانیں گے۔ دوم یہ کہ ''وَالۡمَنۡشَطِ وَالۡمَکۡرَہِ'' یعنی ''چاہے ہماری طبیعت میں آمادگی ہو' نشاط ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں کو مجبور کرنا پڑے'' —— اطاعت کی بحث میں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اطاعت اصلاً تو طوعِ خاطر سے اور بطیبِ خاطر ہی مطلوب ہے' لیکن جماعتی زندگی میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ ''someone has blundered'' آپ کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ میرا امیر غلطی کر رہا ہے' لیکن اگر وہ معصیت کا حکم نہیں دے رہا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی صریح حکم کے خلاف حکم نہیں دے رہا' تو اگرچہ یہ حکم آپ کی رائے کے خلاف ہو لیکن آپ کو ماننا ہوگا۔ اس میں ظاہر ہے کہ آپ کو اپنی رائے کو دبانا ہوگا' اپنے نفس کو گھونٹنا ہوگا' لیکن اطاعت بہر حال لازم ہوگی۔ سوم یہ کہ

’’وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا‘‘ یعنی ’’اور چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے‘‘۔ جماعتی نظام میں یہ مرحلہ لازماً آ جاتا ہے۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے‘ جو وسوسہ بھی ہو سکتا ہے اور کسی کی واقعی رائے بھی ہو سکتی ہے‘ کہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہوں‘ میرے اندر اس کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری standing بہت ہے‘ میں بہت عرصے سے جماعت کے اندر ہوں‘ لیکن ایک شخص جو بالکل نووارد تھا اسے امیر بنا دیا گیا ہے۔ ایسے معاملات رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بھی پیش آئے ہیں۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا تو کئی لوگوں نے اعتراضات کیے اور کہا گیا کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ایک آزاد کردہ غلام کی کمان میں دیے جا رہے ہیں! حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ واقعتاً بڑے جلیل القدر صحابی تھے‘ حضورؐ کے چچا زاد بھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے۔ پھر حضور ﷺ نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو امیر بنایا تو اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ اُس وقت حضور ﷺ نے بڑے غصے سے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے کہ اگر آج تم لوگ اسامہ کی امارت پر اعتراض کر رہے ہو تو تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔

انسانی معاملات میں یہ ساری چیزیں پیش آ سکتی ہیں‘ پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ نے جب بیعت لی تو ’’وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا‘‘ کے الفاظ سے اہل بیعت کو گویا باندھ لیا‘ کیونکہ یہ فیصلہ اور اختیار صاحبِ امر کا ہوتا ہے کہ وہ کس کے حوالے کوئی ذمہ داری کرتا ہے۔ چنانچہ بیعت میں یہ شرط بھی شامل ہو گئی کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے ہم اطاعت کریں گے۔

اب جماعتی نظام میں ماتحت امراء کا ایک نظام ناگزیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ماتحت امراء تھے۔ آپؐ کوئی جیش بھیجتے تو اس کا کسی کو سپہ سالار مقرر فرماتے۔ پھر کسی ایک ہی لشکر میں مختلف دستوں کے مختلف امراء ہوتے تھے‘ میمنہ کا امیر کوئی اور‘ میسرہ کا کوئی اور‘ قلب پر کوئی اور‘ اور ہراول دستے کا امیر کوئی اور ہوتا۔ غزوۂ احد میں درّے پر جو پچاس تیر انداز مقرر کیے گئے ان پر بھی ایک امیر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ

یہ بیعت بھی لی گئی کہ ''وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَهٗ'' یعنی جو بھی صاحب امر ہوں گے' ماتحت امراء ہوں گے' ان سے ہم امر کے معاملے میں جھگڑیں گے نہیں' وہ جو حکم دیں گے اسے بھی مانیں گے۔ اس میں وہ استثناء بہر حال موجود رہے گا کہ وہ معصیت کا حکم نہیں دے سکتے۔ اس بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ ماتحت امراء کا معاملہ' چاہے وہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھا' اور حضور ﷺ کے انتقال کے بعد چاہے مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو اور چاہے کسی جماعت کا امیر ہو' سب کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہو گی اور یہ اس سے باہر نہیں جا سکتے' اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتے۔

اس حدیث میں آگے الفاظ آئے ہیں: ''اِلَّآ اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْهِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَانٌ''۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں صیغہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے تک کے الفاظ بیعت کرنے والوں کی طرف سے' جمع متکلم کے صیغہ میں ہیں' لیکن اس ٹکڑے میں جمع مخاطب کا صیغہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان الفاظ کا اضافہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اِلَّآ اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْهِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَانٌ''۔ سوائے اس کے کہ تم دیکھو کوئی کھلا کفر جس کے لیے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل موجود ہو''۔ یعنی تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ یہ بات کتاب وسنت کے منافی ہے' یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے' یہ کفر ہے' اس لیے میں نہیں مانوں گا! جیسے کہ وہ معاملہ ہوا کہ امیر نے خودکشی کا حکم دیا کہ آگ کے گڑھے میں کود جاؤ' لیکن مامورین نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر کہیں وہ اس آگ میں کود گئے ہوتے تو کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

اس بیعت میں آخری بات یہ ہے کہ ''وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا'' یعنی ''اور یہ کہ ہم حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے''۔ حق بات کہنا اور صحیح مشورہ دینا اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ کسی بھی ہیئت اجتماعی میں اس کا ایک نظام موجود ہونا ناگزیر ہے اور اس کے بغیر کوئی جماعتی زندگی صحیح اور صالح نہیں رہ سکتی۔ امیر کا انداز تحکمانہ نہیں

ہونا چاہیے بلکہ اسے باہمی مشورے سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ چنانچہ بیعت کی بنیاد پر بننے والی تنظیم میں بھی مشورہ کا نظام لازمی ہے۔ ''لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ ''یعنی ''ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ کوئی شخص یہ سمجھتے ہوئے کہ میری حیثیت ہی کیا ہے اور میں کچھ کہوں گا تو لوگ اس پر ہنس پڑیں گے' خاموش رہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اسے کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کی جو رائے ہے وہ دیانت داری کے ساتھ پیش کر دینی چاہیے۔ البتہ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کے نظم جماعت میں فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں ہوتا ع ''کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید!'' یعنی دو سو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسان کا ذہن وجود میں نہیں آتا! اقبال نے اس شعر میں بڑی سیدھی سی بات بیان کر دی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ ہے ع ''گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو!'' یعنی یہ جو مغرب کا تصورِ جمہوریت ہے کہ ووٹوں کی گنتی سے معاملات طے کیے جائیں اس سے بچو! اسلامی نظم جماعت میں باہمی مشورے کے بعد فیصلے کا اختیار صاحبِ امر کو حاصل ہوتا ہے۔

بیعت کا موقع و محل

اس بیعت سمع و طاعت کے بارے میں ایک اہم بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بیعت مکّہ میں نہیں لی۔ یہ بیعت اگرچہ مکی دور میں ہی ہوئی ہے' لیکن سمجھ لیجیے کہ یہ کس مرحلے پر ہوئی ہے۔ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے والے تعداد میں بہت کم تھے۔ پھر چونکہ سب مسلمان ایک ہی شہر میں تھے لہٰذا سب کا واسطہ و تعلق حضور ﷺ کے ساتھ براہِ راست تھا۔ آپؐ کا ہر حکم ہر ایک کو براہِ راست پہنچتا تھا' یا زیادہ سے زیادہ کسی پیغام رساں کی ضرورت ہوتی تھی۔ حضرت خباب بن ارت اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما جیسے حضرات دارِ ارقمؓ میں حضور ﷺ کے پاس ہمہ وقت موجود رہتے تھے اور جونہی کوئی وحی نازل ہوتی یہ مکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں میں پہنچ کر تازہ نازل ہونے والی قرآنی آیات کی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ اور کسی درمیانی نظم کی ضرورت نہیں تھی' لہٰذا کوئی ماتحت امراء نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے مکہ میں

ایمان لانے والے صحابہ سے بیعت نہیں لی۔ لیکن جب یثرب سے لوگ آپ ﷺ کی دعوت پر ایمان لانے لگے اور ایک سال میں چھ افراد ایمان لائے' دوسرے سال وہ بارہ ہو گئے اور تیسرے سال میں جب بہتّر (۷۲) افراد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تب آپؐ نے ان سے مذکورہ بالا الفاظ میں بیعت لی اور ان میں سے بارہ حضرات کو ان پر نقیب مقرّر کر دیا۔ ہم نے تنظیم اسلامی کے ماتحت نظم میں ''نقیب'' کا لفظ وہیں سے لیا ہے۔ نیز قرآن مجید میں بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں پر بارہ نقباء مقرر تھے' یعنی ہر قبیلے پر ایک نقیب تھا۔ نقیب کے معنی ہیں خبر گیری کرنے والا' دیکھ بھال کرنے والا' نگرانی کرنے والا۔ تو حضور ﷺ نے بہتّر (۷۲) میں سے بارہ افراد کو نقیب مقرر کر دیا' گویا ہر نقیب کے حوالے پانچ پانچ مسلمانوں کو کر دیا کہ وہ ان کے حالات کی خبر گیری کرے' ان کی نگرانی اور رہنمائی کرے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان بہتّر افراد کا حضور ﷺ سے براہِ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ تو اگلے سال حج ہی کے موقع پر آئیں گے تو ملاقات ہو گی۔ گویا یہ بیعت درحقیقت ایک ایسے نظم جماعت میں لی گئی جس میں کچھ درمیانی امراء اور عہدیدار بھی ہوں اور ہر صاحبِ ایمان کا براہِ راست حضور ﷺ کے ساتھ رابطہ نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی حدیث کو تنظیم اسلامی کے لیے بیعت کی بنیاد بنایا ہے۔ اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ نظم جماعت کے لیے صرف ایک اس حدیث کے اندر مکمل دستور موجود ہے۔ ہم نے اگرچہ تشریح و توضیح کے لیے اس کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی بنایا ہے' اس کے قواعد و ضوابط بھی طے کیے ہیں اور نظام العمل بھی ترتیب دیا ہے' لیکن اس سب کا دار و مدار درحقیقت اسی پر ہے۔ اسی حدیث سے استنباط اور استدلال کرتے ہوئے ہم نے اپنا جماعتی نظام تشکیل دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ''وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا'' اور ''آمُرُکُمۡ بِخَمۡسٍ: بِالۡجَمَاعَۃِ وَالسَّمۡعِ وَالطَّاعَۃِ وَالۡھِجۡرَۃِ وَالۡجِھَادِ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ'' اور پھر اس سمع و طاعت کے لیے یہ مسنون بیعت سمع و طاعت' جو متفق علیہ احادیث سے ثابت ہے' ہم ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ آمین!!

بَارَکَ اللّٰہُ لِیۡ وَلَکُمۡ فِی الۡقُرۡآنِ الۡعَظِیۡمِ' وَنَفَعَنِیۡ وَاِیَّاکُمۡ بِالۡآیَاتِ وَالذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ